مسلمان اور موجودہ سیاسی جنگ

از جناب خان بہادر نواب مجیب ذکاء اللہ خان صاحب ایم۔اے

جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مدیر "ترجمان القرآن" نے اسلامی ہند کے مستقبل اور مسلمانوں کے آج کل کی سیاسی کشمکش میں شرکت کے متعلق ایک نہایت اہم مضمون سپردِ قلم کیا ہے جو ترجمان القرآن کی گذشتہ چند اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔

فاضل مدیر نے اپنے اس مضمون میں مسئلۂ زیر بحث کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر خلوص اور سچے جذبہ اسلامی سے متاثر ہو کر لکھا ہے کہ اس مضمون سے کلاً یا جزاً اختلاف کرتے ہوئے دل دکھتا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو مولانا کی رائے سے مسئلۂ ہذا کی بحث کے کسی جزو سے اختلاف ہو، جیسا کہ راقم الحروف کو مولانا کے اکثر تسلیم کردہ قضایا اور ان کے نتائج سے ہے، مگر وہ مولانا کے صحیح جذبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی اصلی رائے کا اظہار نہ کرے، تو وہ نہ صرف اظہار حق ہی میں قاصر رہیگا بلکہ مولانا ممدوح کے اس مقصد کے فوت کرنے کا باعث بھی ہوگا جو اس بحث کے چھیڑنے سے ہے یعنی اہل الرائے مسلمانوں کا آزادانہ طور پر تبادلہ خیالات کرنا اور اس کے ذریعہ سے اپنے لیے کوئی متفقہ لائحۂ عمل تجویز کرنا۔

مگر نفس مضمون پر بحث شروع کرنے سے پہلے میں مولانا کو اس امر کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بیش قیمت رسالہ میں اس بحث کو چھیڑ کر علماء کرام کی توجہ ان سیاسی مسائل کی طرف دلائی، چنانچہ جریدۂ الفرقان (بریلی) نے بھی مولانا کے اس مضمون کے بڑے حصہ کو ماہ جمادی الاولیٰ

لہ ترجمان القرآن۔ اس مضمون میں جتنے اہم نکات بحث طلب ہیں ان پر ہم نے نمبر لگا دیے ہیں تاکہ ہم کو اپنے جواب میں عبارتیں نقل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے ناظرین ہر نمبر کا جواب ساتھ ساتھ دیکھتے جائیں تاکہ انہیں اس بحث کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

کی اشاعت میں ایک موثر نوٹ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ امید ہے کہ مولانا کے مضمون کا یکے بعد دیگرے ان ہر دو رسالوں میں شائع ہو جانا ضرور علماء کرام کی توجہ کا باعث ہوگا اور علماء کرام ضروری بحث و تمحیص کے بعد کوئی سیدھا سے سیدھا طریق کار تجویز فرما دیں گے، اور وہ بھی جلد از جلد کیونکہ اب ایک منٹ بلکہ ایک لمحے کے ضائع کرنے کی بھی مہلت نہیں ہے۔

مضمون مذکور کی نسبت سب سے پہلے جو کچھ میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مضمون اس قدر بلند پایہ اور فاضلانہ ہے کہ اس کو خواص ہی سمجھ سکتے ہیں اور وہی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں، عوام کے فہم اور ادراک سے وہ بالاتر ہے حالانکہ کسی ایسے مسئلہ کی بابت جو سیاسیات سے متعلق ہو اور جس کی نسبت اس امر کی ضرورت ہے کہ ہر خاص و عام اپنی رائے قائم کرنے کے لیے غور و فکر کرے، اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے اس بات کی ضرورت تھی کہ بحث عام فہم ہوتی تاکہ عوام اس سے فائدہ اٹھا سکتے۔

اب اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہوئے مجھکو یہ عرض کرنا ہے کہ لائق مضمون نگار نے ایک نہایت فاضلانہ تمہید میں سیاسی کام کرنے کے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آجکل عمل پیرا ہیں لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد خود جو طریقہ کار مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے اگر اس کے سمجھنے میں میں غلطی پر نہیں ہوں تو وہ طریقہ بالکل ہی ناقابل العمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے، چنانچہ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"مذکورہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھکر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے لیے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان کی آزادی کا حصول ممکن ہو اس غرض کے لیے ہمکو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنا چاہئیں وہ حسب ذیل ہیں۔"

اس کے بعد مولنا موصوف نے اُن کاموں کو گنایا ہے جن پر جنگ آزادی میں شرکت کرنے سے پہلے ہمکو اپنی قوتیں صرف کرنا چاہئیں اور وہ بالفاظ مولنا مختصراً یہ ہیں:۔

(۱) مسلمانوں میں ایک وسیع پیمانہ پر اصول اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جاوے۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً بھی احکام اسلام کا تبع بنانے کی کوشش کی جاوے۔

(۳) مسلمانوں کی رائے عامہ کو اس طرح ترتیب دیا جاوے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے پر مستعد ہو جاویں؛

(۴) ہمیں اپنی اجتماعی قوت کو اتنا مضبوط کر لینا چاہیے کہ ہم اپنی جماعت کے غداروں اور منافقوں کا استیصال کر سکیں؛

(۵) ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کی قیادت کا منصب ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں آجاوے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے دوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر تو آمادہ ہو مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہو؛

(۶) مسلمانوں میں ایسا اتحاد عمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ سب تن واحد کی طرح ہو جاویں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں؛

یہ مقاصد بہت اعلیٰ و ارفع ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنا چاہیے مگر فاضل مضمون نگار نے یہ نہیں بتلایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اندازاً کس قدر مدت درکار ہوگی؟ اور اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے حصول کے لیے صدیاں بھی کم ہیں۔ (۱)۔ تو کیا ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی رہے گی جبتک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہو جاویں؛ نیز اس نتیجہ پر پہنچنے میں مولنا سے یہ بات بھی نظر انداز ہو گئی ہے کہ سیاسی یا آزادی کی جنگ کا شروع کرنا

یا کرنا ہم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو اور جب تک ہم چاہیں وہ شروع نہ ہو۔ سیاسی یا آزادی کی جنگ تو بہت عرصہ ہوا شروع ہو چکی اور برادران وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے اور نئے معرکوں کے فتح کرنے کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ پس ایسی صورت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ۔

"بھائیو! ذرا ٹھہرو، ہمیں بھی تیار ہو جانے دو، تب جنگ شروع کرنا"

ہماری ایسی آواز کو کون سن سکتا ہے؟ اور اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی کان دھر سکتا ہے؟ (۲)

سیاسی جنگ تو اصل میں ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء میں شروع ہوئی تھی جبکہ کانگریس پہلے پہل عالم وجود میں آئی، سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ لائحہ عمل تجویز کیا جس پر مسلمان ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء تک عامل رہے اور اس کے بعد مسلم لیگ وجود میں آئی مگر سیاسی جنگ برابر جاری رہی، یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہو گئی اور جنگ کے دوران ہی میں مسٹر مانٹیگ (Montague) حکومت برطانیہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہندوستان آئے اور انہوں نے حکومت برطانیہ کی طرف سے اعلان کیا کہ "وہ آئندہ ہندوستانیوں کو حکومت ہند میں مزید اختیارات دیئے جائیں گے"۔ چنانچہ جنگ کے ختم ہوتے ہی Montague - chamsford Reforms) یا مانٹیگ چیمسفرڈ نامی اصلاحات وجود میں آئیں مگر ہندوستانی ان اصلاحات سے مطمئن نہ ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ (Non - Cooperation) یا عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی۔ جو ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں بہت زور پر رہی اس تحریک میں مسلمانوں نے بھی بڑے پیمانہ پر حصہ لیا کیونکہ مسئلہ خلافت کے متعلق دول یورپ نے جو فیصلہ کیا تھا اس سے مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیل گئی تھی اس لیے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کانگریس کی شریک کار بن گئی اور (Non - Cooperation) یا عدم تعاون اور (Civil disobidience) کی تحریک کو دبانے میں گورنمنٹ کی طرف سے جو تعزیری

کارروائیاں عمل میں آئیں اُن کو ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی برابر کے درجہ میں برداشت کیا چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک جو مسلمان عدم تعاون کی تحریک کے سلسلہ میں جیل گئے ان کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں آبادی کا لحاظ رکھتے ہوے کسی طرح کم نہ ہوگی۔

سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد بعض ان وجوہ سے جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے ہندو مسلمانوں کی راہیں پھر الگ ہونا شروع ہوگئیں اور مسلمان رفتہ رفتہ کانگریس سے علٰحدہ ہونے لگے۔ چنانچہ سنہ ۳۱ء و سنہ ۳۲ء میں عدم تعاون کی تحریک نے جب دوبارہ زور پکڑا تو اس تحریک میں مسلمانوں کا حصہ نسبتاً بہت کم تھا۔ سنہ ۱۹۳۲ء کے آخر تک لارڈ ولنگ ڈن کی گورنمنٹ عدم تعاون اور (Civil disobidience) کی تحریک کو دبانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی لیکن کانگریس نے اگرچہ (Civil disobidience) کی تحریک کو اٹھا لیا تاہم اُس نے اپنا پروپگنڈا عوام میں، کاشتکاروں اور مزدوروں میں برابر جاری رکھا اور چونکہ یہ پراپگنڈا امن عامہ کے مناقض نہیں تھا اس لیے گورنمنٹ نے بھی اس سے کچھ تعرض نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کا اثر عام رائے دہندگان پر بڑھتا گیا ادھر گورنمنٹ برطانیہ نے تینوں گول میز کانفرنس (The Three Round Table Conferences) کی تجاویز کے مطابق گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آف سنہ ۳۵ء پاس کرا دیا جس کی رو سے صوبہ جات میں کم از کم ہم ہندوستانیوں کو بہت کچھ اختیارات دیدئے گئے ہیں۔ چونکہ کانگریس نے سنہ ۱۹۳۲ء سے مسلسل کاشتکاروں، دستکاروں، اور مزدوروں میں اپنا پروپگنڈا جاری رکھا تھا اور اس کے علاوہ کوئی سیاسی پارٹی ایسے منظم طریقہ اور ایسی جد وجہد سے عوام میں کام نہیں کر رہی تھی اس لیے گذشتہ انتخابات میں کانگریس کو بہت ہی بڑے پیمانہ پر کامیابی حاصل ہوی یعنی ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ بڑے صوبوں یعنی بہار، ممالک متحدہ آگرہ و اودھ، ممالک متوسط، مدراس اور بمبئی میں کانگریس ہی کو کامیابی ہوی اور اس وقت ان سب صوبوں میں کانگریس ہی کی وزارت کام کر رہی ہے۔

پس جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا تھا کانگریس پارٹی آدھا معرکہ آپ سے پہلے ہی سر کر چکی ہے۔ اب اس کو صرف گورنمنٹ ہند میں اکثریت حاصل کرنے یا نہ کرنے کا معرکہ باقی رہ گیا ہے، اس لیے مسلمانوں کا یا مسلمانوں کے کسی خاص گروہ کا یہ کہنا کہ ہم ابھی جنگ کے لیے تیار نہیں ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہم جیسے کچھ بھی ہیں اسی حالت میں ہم کو جنگ کرنا ہوگا، اگر ہمارے پاس اس جنگ کے لیے آلات نہیں ہیں تو ہم کو نہتے ہی لڑنا پڑے گا، اگر ہمارے ہتیار پرانے، دقیانوسی اور زنگ آلود ہیں تو انہیں دقیانوسی ہتیاروں کو استعمال کرنا ہوگا، یہ ایک اور بات ہے کہ دوران جنگ ہی میں ہم اپنے ہتیاروں کو صیقل اور انکا زنگ دور کرتے جاویں یا اور نئے ہتیار تیار کرتے جاویں، اور دراصل ہم کو ضرور ایسا ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اس کے سوائے ہمارے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے اس وقت اس کا بھی موقع نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی خاص گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں، اور نہ اس کا موقع ہے کہ پرانے تعلیمیافتہ لوگ نئے تعلیمیافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہکر خارج کر دیں کہ تم اس کے اہل نہیں ہو اور اس لئے ان کو پرچم آزادی کے تلے کھڑے ہونیکی اجازت نہ دی جائے۔ اور نہ جدید تعلیمیافتہ حضرات کو اس امر کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ وہ پرانے تعلیمیافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں، بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق، متحد، یکدل اور یک زبان ہو کر اس مدافعانہ جنگ میں حصہ لیں۔ اور کانھم بنیان مرصوص کا صحیح مصداق بن کر دنیا پر ثابت کر دیں کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، اور نیز یہ کہ دنیا کی کوئی طاقت کوئی قوت اور کوئی تدبیر اس نور الٰہی کو بجھا نہیں سکتی جسکے مسلمان حامل ہیں۔ (۳)

مضمون کے اصل موضوع سے بحث کا جس قدر تعلق تھا وہ یہاں ختم ہو جاتا ہے لیکن فاضل مضمون نگار نے دوران تحریر میں بہت سی وہ ضمنی بحثیں بھی چھیڑ دی ہیں جو مضمون کے اصل

موضوع سے کچھ زیادہ متعلق نہ تھیں، اور چونکہ انہیں ضمنی بحثوں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور میرے
خیال میں یہی ضمنی بحثیں اصل موضوع سے زیادہ حضرات علماء کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کریں گی اس لیے
ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان ضمنی بحثوں کی بابت بھی تھوڑا بہت اظہار خیال کیا جاوے مگر ان ضمنی بحثوں
میں ہر ایک بحث کے متعلق تنقید کرنا خالی از طوالت نہ ہوگا۔ تاہم ان میں سے بعض کی بابت کچھ نہ کچھ
لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ناظرین کرام کے سامنے تصویر کے ہر دو رخ آجا دیں،

ان ضمنی بحثوں میں سے جو ضروری ہیں وہ مولٰنا موصوف کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

"سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور
معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول
کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت
کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی
اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ ......
مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سوچ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا
مگر جذبات وتخیلات تو کچھ ایسے ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش نوے فی صدی لوگوں
پر اس تعلیم کے نہایت مہلک اثرات مرتب ہوئے ..... وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام
کیا ہے؟ اور مسلمان کس کو کہتے ہیں؟ اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز ما بہ الامتیاز
ہے۔ خواہشات نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے اور یہ معبود انہیں اس مغربی تہذیب
کی طرف لیے جا رہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر طلب کو پورا کرنے کا
ذمہ لے رکھا ہے ...... وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔
..... نماز پڑھنا ان کے یہاں معیوب ہے اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے اُسے

ان کی سوسائٹی میں بنایا جاتا ہے بخلاف اس کے سینما جانا ان کے نزدیک نہ صرف مستحسن بلکہ ایک مہذب انسان کے لیے لوازم حیات میں سے ہے'۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں...... یہ چیز اب تک ہمارے مردوں میں تھی مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے..... ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس کے طور طریق سے آراستہ کیا جا رہا ہے"۔

المختصر مولنٰا کے خیال کے مطابق گذشتہ ستر سالہ مغربی تعلیم کے اثر سے مسلمان مسلمان نہیں رہے اور نیز یہ کہ گذشتہ ڈیڑھ صد سالہ غلامی کی وجہ سے مسلمانوں میں جو قومی ملی اور اخلاقی کمزوریاں اس دور کی ابتداء میں تھیں ان میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اور ان کے علاوہ بھی دوسری اور نئی کمزوریاں ان میں پیدا ہو گئیں، خود غرضی انفرادیت، اور نفس پرستی کی وجہ سے قومیت کا احساس مسلمانوں سے مٹتا جا رہا ہے اور ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے۔

متذکرہ بالا اقتباسات میں مولانا نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی بابت عموماً اور مغربی تعلیم نیز مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی بابت خصوصاً جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ اگرچہ بہت زیادہ مایوس کن ہیں مگر چونکہ خیالات بالکل نیک نیتی پر مبنی ہیں اس لیے کسی کو مولنٰا سے کسی شکایت کا موقع نہیں ہے اور معمولاً راقم الحروف اس بحث میں پڑنا پسند نہیں کرتا کہ مولنٰا کے یہ خیالات کہاں تک صحیح ہیں؟ مگر چونکہ علماء کے گروہ کو مغربی تعلیم سے اب تک اجتناب اور مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے ہمیشہ سوءِ ظن رہتی رہا ہے اور اب بھی ہے اس لیے خطرہ تھا کہ فاضل مضمون نگار کے یہ خیالات جن کو نہایت ہی قوی اور موثر طریقہ سے ظاہر کیا گیا ہے اور جن کا مختصر سا نمونہ میں نے اوپر کے اقتباسات میں ہدیہ ناظرین کیا ہے علماء کے مغربی تعلیم کی طرف سے اجتناب اور مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے بدظنی کو کہیں اور زیادہ

نہ بڑھا دیں جس کی وجہ سے علماء کا گروہ نئے تعلیمیافتہ گروہ کے ساتھ موجودہ سیاسی جنگ میں بھی اشتراک عمل پسند نہ کرے حالانکہ ضرورت اس وقت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا ہر گروہ متفق، متحد، ایک رائے اور یک دل ہو کر موجودہ سیاسی جنگ میں حصہ لے۔ اس بارہ میں جو کچھ میں آئندہ عرض کرنے والا ہوں وہ صرف اسی مقصد کو مدنظر رکھکر عرض کروں گا۔

یہ تسلیم ہے کہ ہم میں خود غرضی وانفرادیت ہے، ہماری اجتماعی طاقت بہت ہی کمزور ہے مگر یہ سب کچھ الفاظ اضافی ہیں۔ ہمکو اپنی کمزوری بمقابلہ دیگر ہمعصر اقوام کے تسلیم ہے مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبون تر اور زیادہ خراب ہے اور مذکورہ بالا اخلاقی خرابیاں اور سیاسی کمزوریاں پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو مستلزم ہوتا تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں اب سے تقریباً ایک ہزار برس گذر گئے مگر ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ آج سے ایک ہزار برس پہلے کے بہت اچھی اور بہتر ہے مسلمانوں کی ہی حکومت کے زمانہ میں انہوں نے بہت سی علمی اور ذہنی ترقیاں کیں، عام بت پرستی سے انمیں کے بہت سے گروہوں نے توحید کی طرف رجوع کیا، اور اُن کی موجودہ ہر قسم کی ترقی تو کسی تشریح اور توضیح کی محتاج نہیں ہے۔ (۴)

پس مسلمانوں کی بابت بھی یہ کہنا کہ وہ گذشتہ ڈیڑھ صد سالہ عرصہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں زوال اور انحطاط ہی کی طرف گئے ہیں راقم الحروف کے نزدیک صحیح نہیں ہے، مسلمانوں نے بھی اس ڈیڑھ صدی میں کچھ نہ کچھ ترقی کی مگر ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم چنانچہ سلطنت مغلیہ کے انتزاع کے وقت یعنی اٹھارہویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کی حالت ہر حیثیت سے اس قدر پست ہو چکی تھی کہ اس سے زیادہ پست حالت کا نقشہ ذہن میں آنا مشکل ہے۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنی

بالکل فنا ہونے سے پہلے ایک آخری سنبھالا لیا تھا جبکہ شمالی ہند میں روہیلوں نے بسرکردگی نواب نجیب الدولہ و بامداد احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی متفقہ قوت کو پانی پت کے میدان میں ایک بڑی شکست دی تھی۔ اس کے بعد شمالی ہند میں مسلمانوں کی سیاسی قوت بجائے صفر کے رہ گئی۔ اس زمانہ میں سات سمندر پار سے ایک قوم ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتی ہے، اُس کی بہت ہی محدود قوت مغلوں کی اسلامی سلطنت سے ٹکراتی ہے اور آن کی آن میں یہ اسلامی سلطنت پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اس دوران انتزاع میں مسلمانوں کا کوئی گروہ خواہ وہ گروہ علماء کا ہو، یا امراء کا، خواص کا ہو یا عوام کا غرض کوئی گروہ بھی ایسا کھڑا نہیں ہوتا جو اس اسلامی سلطنت کو اس انتزاع سے بچا سکے یا بچانے کی کوشش بھی کرے۔ البتہ حضرت مولٰنا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ضرور اخیر وقت میں علم جہاد بلند کیا مگر وہ بھی سکھوں کے خلاف۔ انگریزوں کے خلاف نہیں۔

اس وقت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس وقت کے مسلمانوں میں اپنے دین یا اپنی قوم کی حفاظت کا کوئی جذبہ باقی تھا، بلکہ بجائے اس کے کہ مسلمان متفق ہو کر اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے مذہب کی حفاظت کرتے وہ ایک دوسرے کے ساتھ غداری کرتے نظر آتے ہیں۔ بنگال میں میر قاسم اور میر جعفر اور سراج الدولہ ایک دوسرے کے ساتھ غداری کرتے ہیں تو وسط ہند میں شجاع الدولہ انگریزوں کی مدد سے روہیلوں کا استیصال کرتا ہے جس کا نتیجہ خود شجاع الدولہ اور اس کے جانشینوں کے واسطے یہ نکلتا ہے کہ اس برائے نام فتح کے بعد شاہان اودھ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رہتی۔

اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری موجودہ اقتصادی اور تعلیمی حالت آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی حالت سے ابتر ہے۔ طوائف الملوکی اور آئے دن کی خانہ جنگیوں میں کسی قوم کی اقتصادی حالت کیا خاک درست رہ سکتی ہے؟

علی ہٰذا یہی کیفیت تعلیمی حالت کی تھی عمومی تعلیم تو بالکل ہی مفقود تھی دینی تعلیم ضرور بعض بزرگوں کے طفیل (یعنی علماءِ فرنگی محل لکھنؤ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے خاندان) سے جاری رہی اور حقیقت میں ہم سب مسلمانوں کو ان بزرگوں کا مشکور ہونا چاہئیے، مگر انہیں کے پایہ کی آج موجودہ ہند میں دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیگر اسلامی درسگاہیں موجود ہیں۔

پس جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ہماری موجودہ حالت آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی حالت سے بدتر نہیں ہے۔ البتہ اس درمیان میں ہم نے اُس سرعت رفتار سے ترقی نہیں کی جسکے ساتھ دوسری ہمسایہ اقوام نے ترقی کی ہے اور کسی قوم کا اپنی ہمسایہ اور ہمعصر اقوام کی رفتار پر ترقی نہ کرنا ہی اس کے تنزل کا مترادف ہے۔

دیگر اقوام ہند کی ترقی کی رفتار کے مطابق ہماری ترقی نہ کرنے کے مختلف اسباب میں اول تو ہم جدید تعلیم کی طرف بمقابلہ دیگر اقوام کے دیر سے آئے دوسرے یہ کہ جو سیاسی پالیسی سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے واسطے تجویز کی تھی اور جس پر کم و بیش ۱۹۰۶ء تک مسلمان عامل رہے وہ پالیسی ایسی تھی جس نے مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا نہیں سکھلایا۔ اس لیے ہم سیاسیات میں دیگر اقوام ہند سے پیچھے رہ گئے اور اب اس کی ضرورت ہے کہ ہم اوروں سے تیز چل کر تلافی مافات کی کوشش کریں۔

علی ہٰذا یہ تسلیم ہے کہ مغربی تعلیم جس سے علوم اور انکشافات جدیدہ کی تعلیم مراد ہے وہ اپنے متعلمین میں نئے خیالات اور نئے احساسات پیدا کرتی ہے مگر یہ تسلیم نہیں کہ علوم جدیدہ کی تعلیم میں فی نفسہٖ کوئی ایسی بات ہے کہ وہ ایک مسلمان کو عقائد اسلام سے پھیر دے، وہ علوم جدیدہ کیا ہیں؟ یہی نا! کہ حقائق عالم کی بابت نئے نئے انکشافات، پس یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کو ان نئے انکشافات کا علم ان کے معتقدات سے کیوں برگشتہ کر دیگا؟

کہا جائیگا کہ جس ماحول میں ان نئے انکشافات کی تعلیم دی جاتی ہے وہ ایسا ہے کہ مسلمان طالب علموں کے دینی عقائد کو ایک حد تک متزلزل کر دیتا ہے۔ یہ بات ایک حد تک قابل تسلیم ہے مگر اس کا علاج یہ تو نہیں ہے کہ ہم ان علوم جدیدہ کی تعلیم کو ممنوع قرار دیدیں، اور اپنے گرداگرد ایک حصار کھینچ لیں کہ نئے انکشافات کی روشنی ہم تک پہنچ ہی نہ سکے بلکہ اگر ہم مسلمان اپنے گرداگرد ایک حصن حصین کھینچ لیں تب بھی ہم اپنے آپ کو ان نئے خیالات کے اثر سے محفوظ نہیں رکھ سکتے (۵) فاضل مضمون نگار کو خود تسلیم ہے کہ علاوہ دیگر مغربی خیالات کے ایک نیا مغربی تخیل جو (Com munism) یا اشتراکیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہندوستان میں پھیلتا جا رہا ہے، فاضل مضمون نگار کی رائے سے مجھے اتفاق ہے مگر عام ناظرین کی اطلاع کے لیے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ وہ تخیل ہے کہ جس کے خلاف یورپ کی تمام سرمایہ دار اقوام گذشتہ پندرہ بیس سال سے علم جہاد بلند کئے ہوئے ہیں۔ اور جس تخیل کی ہندوستان میں اشاعت کے خلاف گورنمنٹ آف انڈیا ابتدا ہی سے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہے مگر تاہم ہندوستان میں Communism کے تخیل کی اشاعت کو روکا نہ جا سکا۔

لہذا علماء اگر مسلمانوں کو نئے علوم اور نئے خیالات کے اثرات سے (اگر کچھ ہوں) محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج اگر ہے تو صرف یہی کہ علماء خود اُن اداروں میں ان علوم جدیدہ کو جاری کریں جوان کے زیر اثر یا زیر اہتمام کام کر رہے ہیں تاکہ ان علوم جدیدہ کی تعلیم ایسے ماحول میں دیجا سکے جس سے متعلمین کے مذہبی عقائد پر کوئی برا اثر نہ پڑ سکے۔

یہاں پہونچکر یہ کہا جائیگا کہ عربی مدارس کے ذرائع آمدنی ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنے یہاں علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام کر سکیں، اور یہ بالکل صحیح ہے لیکن اگر علماء مجھکو معاف فرما دیں تو میں عرض کر دونگا کہ اس موجودہ مالی حالت کے سقم کا ذمہ دار ایک حد تک خود علماء کا ہی گروہ ہے، اس لیے

کہ تعلیم دین جو عربی مدارس میں دیجاتی ہے وہ تو لازمی چیز تھی کیونکہ وہی مقصود بالذات ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس کی کیا ضرورت تھی کہ طلبہ کا بہت سا وقت منطق اور فلسفہ قدیم کی تعلیم میں صرف کرایا جاوے؟ اور ان کے مقابلہ میں کار آمد علوم جیسے ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم سے ان کو محروم رکھا جائے پس اگر ہمارے عربی مدارس دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مفید دنیوی تعلیم بھی اپنے نصاب میں شامل کر لیتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان پبلک عربی مدارس کی مالی امداد کما حقہٗ نہ کرتی۔ اس لیے اگر عربی مدارس کے موجودہ سسٹم مالی کی بابت یہ عرض کیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ سے

نقص در دوستی ماست کہ او دشمن ماست
آن محبت بہ چہ ارزد کہ سرایت نکند

عربی مدارس کی مالی حالت گو عموماً گری ہوئی ہے تاہم کچھ عربی مدارس ایسے ضرور رہیں کہ وہ اپنی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے علوم جدیدہ کی تعلیم کی کم از کم ابتدا ضرور کر سکتے ہیں مثلاً دارالعلوم دیوبند یا دارالعلوم ندوہ میری رائے میں ایسے ہی ہیں بشرطیکہ ان کے ارباب حل و عقد اس طرف توجہ کریں۔

لیکن عربی مدارس جبتک اپنے یہاں علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے اس وقت تک کے لیے میں ایک دوسری تجویز علماء کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک معین تعداد نئی تعلیم کے مسلم اداروں میں (مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا اسلامیہ کالج لاہور) جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجے جاویں اور یہ کچھ مشکل امر نہیں ہے کہ نئی تعلیم کے ان مسلم اداروں کے منتظمین سے یہ بات طے کر لی جاوے کہ وہ عربی مدارس کے ان فارغ التحصیل طلبہ کے لیے ایک خاص کلاس کھولدیں جس میں ان کو کم سے کم وقت میں زائد سے زائد علوم جدیدہ کی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملے۔ ایسے طلبہ کے لیے وظائف کا انتظام بھی ممکن ہے مگر ابتدا وظائف ان کو اس شرط پر دئے جاویں کہ وہ بعد فراغت کے عربی مدارس میں درس و تدریس کا کام اپنے ذمہ لیں گے۔ نیز یہ کہ نئی تعلیم کے مسلم اداروں کی دینی تعلیم بھی آئندہ انہیں لوگوں کے سپرد کی جائیگی۔

میرے نزدیک یہ تجویز کوئی ناقابل عمل تجویز نہیں ہے۔ اگر فریقین کے ارباب حل و عقد ایک جگہ بیٹھکر اس تجویز کو عملی جامہ پہنانا چاہیں تو بہت آسانی کے ساتھ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ مگر غالباً یہ سوال ہوگا کہ اس کی ابتدا کون فریق کرے؟ پس اگر علمائ نئی تعلیم کے ان مسلم اداروں کو اس قابل سمجھتے ہوں کہ ان کے یہاں کے فارغ التحصیل طلبا ان اداروں میں جا کر نئی تعلیم حاصل کریں تو اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی تحریک نئے تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے ہی ہو سکتی ہے۔

مغربی تعلیم کے ساتھ نئے تعلیمیافتہ گروہ کا جو نقشہ مولنا نے کھینچا ہے اور جس کا کچھ نمونہ منیے اقتباسات متذکرۂ بالا میں پیش کیا ہے اُس کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ ہم میں نقائص بھی ہیں، ہم میں خامیاں بھی ہیں، ہم میں سے بعض کے دلوں میں عقائد مذہبی کی طرف سے شکوک اور شبہات بھی ہیں، ہم سے ارکان اور احکام مذہبی کی پابندی بھی کما حقہٗ نہیں ہوتی ہے جس کی بابت ہم سخت ملامت کے مستوجب ہیں، مگر نئے تعلیمیافتہ گروہ کی جو تصویر مولنا نے کھینچی ہے وہ بہت ہی زیادہ بری اور سیاہ ہے، ہم تو بُرے ہیں مگر غالباً اس قدر بُرے نہیں جس قدر کہ ظاہر کئے جاتے ہیں اور اگر بُرے بھی ہیں تب بھی آخر سگ تو اسی در کے کہلاتے ہیں، جن خامیوں اور برائیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ نئے تعلیمیافتہ گروہ میں سب کی سب موجود سہی مگر ان کے ساتھ ہی غالباً کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو ایک حد تک ان برائیوں کی تلافی کرتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ ابھی تک قبر پرستی، پیر پرستی، اور شخصیت پرستی کے امراض سے پاک ہیں، اسی طرح وہ ابھی تک مختلف مذہبی گروہوں میں منقسم نہیں ہیں جو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوں۔ اور جن میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل قریب قریب ناممکن ہو جیسا کہ علماء نے اپنے آپ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ان میں بدعتی اور وہابی کی کوئی تقسیم نہیں ہے، نہ ان میں کا کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔

مغربی تہذیب میں برائیاں بھی ہیں اور بھلائیاں بھی یہ ہماری اہمیت ہے کہ **خُذ مَا صَفَا**

وَدَعْ مَا کَدِرْ کے زرین اصول پر عمل کرکے ہم بھلائیاں اختیار کریں اور برائیوں سے پرہیز کریں۔

نئی تعلیم کے بارہ میں ہمارے اور علماء کے نقطۂ نظر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ نئی تعلیم اور جدید سائنٹفک انکشافات ہمکو جو کچھ بھی سکھاتے ہیں ان کا علم حاصل کرنے کے باوجود ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور علماء کا گروہ انکشافات جدیدہ اور جدید سائنس سے مسلمانوں کو ناواقف اور جاہل رکھکر ان کو مسلمان رکھنا چاہتا ہے۔

ہم پر اہل مغرب کے تتبع کا الزام لگایا جاتا ہے مگر فی الحقیقت ہم اہل مغرب کا تتبع نہیں کرتے ہیں بلکہ جو قرضہ آزادی رائے، تفقہ فی الدین، شخصیت پرستی سے اجتناب، محنت اور عمل کی قدر کا آج سے صدیوں پہلے ہم نے اہل مغرب کو دیا تھا اور جس کی مدد سے اہل مغرب نے کلیسائے روم پاپائے اعظم اور نا اہل پیشوایان دین کے ظلم و استبداد سے نجات پائی تھی وہ قرضہ مع سود کے اہل مغرب سے ہم وصول کرنا چاہتے ہیں غرض جو سبق آزادی رائے اور تفقہ فی الدین کا ہمنے اہل مغرب کو سکھایا تھا وہی سبق اب ہم ان سے سیکھنا چاہتے ہیں اور علوم و فنون کی جو امانت ہم نے ان کے سپرد کی تھی اس کو اب ہم انسے واپس لینا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری کھری اور قیمتی امانت کے ساتھ اہل مغرب ہمکو بہت سے تباہ کن اور مضرت رسان مزخرفات مثلاً شراب خواری، قمار بازی وغیرہ بھی واپس کرنا چاہتے ہیں اور ہم میں سے بعض ناسمجھ بجائے اپنی اصلی امانت واپس لینے کے ان مزخرفات کو اُن سے لے کر خود اپنے آپ کو اور اسلام کو نقصان پہونچاتے ہیں، پس ہماری کوشش یہی ہونا چاہیے کہ ہم اپنی اصلی امانت واپس لیں اور ان خرافات سے پرہیز کریں۔

ہم پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم اہل مغرب کی ایک ایک ادا پر جان دیتے ہیں۔ اس کی بابت صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگرچہ بعض ظاہری باتوں میں ہم اہل مغرب کا تشبہ ضرور کرتے ہیں مگر نئے تعلیمیافتہ گروہ کے دل میں اہل فرنگ سے جو منافرت اور مغائرت ہے وہ اس سے

زیادہ ہے جو پرانے تعلیمیافتہ گروہ کے بزرگوں کو ہے کیونکہ نئے تعلیمیافتہ گروہ کو اس بات کا علم کہ اہل فرنگ نے ایشیا والوں کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً وقتاً فوقتاً کیا کیا زیادتیاں کی ہیں زیادہ تفصیلی طور پر پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ چنانچہ جب کبھی اہل فرنگ نے مصر طرابلس یا ٹرکی میں مسلمانوں پر مظالم کیے تو نئے تعلیمیافتہ گروہ ہی نے ابتداءً اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بعض بعض صورتوں میں ٹرکی اور قسطنطنیہ کو مشن بھیج کر عملی امداد بھی کی اگرچہ یہ امداد بہت ہی تھوڑی ہو اسی طرح ہندوستان میں جو جنگ آزادی چھڑی اس میں نئے تعلیمیافتہ گروہ ہی نے غالباً زیادہ حصہ لیا۔ پس ان واقعات کے باوجود بھی اس الزام پر اصرار کیا جاوے کہ نیا تعلیمیافتہ گروہ اہل مغرب کی ہر ادا پر جان دیتا ہے تو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے پرانے تعلیمیافتہ بزرگ اپنے قیاس کو ہمارے بیان پر ترجیح دیتے ہیں جو حصول علم کا یقیناً صحیح طریقہ نہیں ہے۔

بہرحال اس بحث کے متعلق میں کچھ اور عرض کرنا نہیں چاہتا اگر بغور دیکھا جائے تو نئے تعلیمیافتہ اور پرانے تعلیمیافتہ اصحاب کی مجموعی تعداد بھی مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں بمنزلہ آٹے میں نمک کے ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا دارومدار زیادہ تر کاشتکاروں اور مزدوروں کے اُس بے زبان طبقہ کے ہاتھ میں ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی اور جو مسلمانوں کی کل آبادی کا ۹/۱۰ حصہ سے زائد ہے اس لیے ہمارا فرض ہے (خواہ ہم نئی تعلیمیافتہ جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یا پرانی تعلیم کے حامی ہوں) کہ ہم اس طبقہ کی اصلاح کریں، اس طبقہ میں اپنے حقوق سمجھنے کا مادہ پیدا کریں اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں کہ وہ اپنے حق رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کے لیے استعمال کریں، اگر ایسا کرنے میں ہم کامیاب ہوگئے تو سمجھ لیجیے کہ ہم نے بڑی حد تک سیاسی جنگ جیت لی (۶)

مولینا ممدوح فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتیں لیں گے، ہم دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے ہمارے حقوق پر آنچ نہ آنے پادے" لیکن مولینا کے خیال کے مطابق چونکہ ان کی آئینی ضمانتوں کے پیچھے کوئی (Sanction) یا ایسی قوت موجود نہ ہوگی جو اکثریت کو ان ضمانتوں پر قائم رہنے کے لیے مجبور کرے اس لیے یہ ضمانتیں بیکار رہوں گی مولینا کا یہ خیال بالکل صحیح ہے مگر آئینی ضمانتوں کے بجائے مولانا کی جو اپنی تجویز ہے اس پر بھی بعینہ یہی اعتراض وارد ہوتا ہے مولینا کی تجویز ہے کہ۔

"مسلمانوں کی حیات قومی برقرار رکھنے کے لیے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں سلطنت کے اندر سلطنت کہا جاتا ہے، ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جبتک کہ خود ان کی جماعت میں کوئی قوت ضابطہ اور ہیئت حاکمہ موجود نہو۔۔۔۔۔"

فرض کیجیے کہ اکثریت پارٹی مسلمانوں کو "سلطنت درسلطنت" دینے پر رضامند بھی ہوگئی، اور مسلمانوں کی سلطنت درسلطنت باہمی میثاق کی رو سے قائم بھی ہوگئی، اور ان کو اپنی سلطنت درسلطنت میں حدود شرعیہ کے جاری کرنے کا حق حاصل بھی ہوگیا لیکن بایں ہمہ مسلمانوں کے پاس کونسی وہ قوت ہوگی جو مسلمانوں کی اس سلطنت درسلطنت کے احکام کا اکثریت پارٹی کی رائے کے خلاف نفاذ کرا سکے؟ مثلاً اکثریت پارٹی فرض کیجیے کہ یہ قانون پاس کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی ایک قلم بند کردی جاوے تو مسلمانوں کی یہ سلطنت درسلطنت اکثریت پارٹی کے نفاذ کو کیسے روک سکتی ہے؟

اسی طرح مسلمانوں کی یہ مفروضہ "سلطنت درسلطنت" اپنے یہاں حدود شرعی جاری کرنا

چاہتی ہے۔ پس فرض کرو کہ کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہو جائے اور حد شرعی کے مطابق اس کو قتل کر دیا جائے تو اکثریت پارٹی اس کی کیسے اجازت دے سکتی ہے؟ خصوصاً جبکہ مسلمان اپنے اس واجبی حق کے قائم رکھنے پر بجا طور پر اصرار کریں گے کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمان بنا دیں۔ اسی طرح مسلمان اگر اپنی سلطنت در سلطنت میں زنا کی حد سنگساری کو جاری کرنا چاہیں اور کوئی مسلمان کسی غیر مسلم عورت سے زنا کا مرتکب ہو۔ یا کوئی غیر مسلم کسی مسلمان عورت سے زنا کا مرتکب ہو تو مسلمانوں کی یہ سلطنت در سلطنت مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر تو زنا کی حد جاری کر گی لیکن کیا اس غیر مسلم مرد اور غیر مسلم عورت کو بلا کسی بازپرس اور سزا کے چھوڑ دے گی؟ (۷)

مولانا نے ایک لفظ "شبہ دارالاسلام" کا بہت ہی اچھا ایجاد کیا ہے۔ مولانا کی خواہش ہے کہ اگر ہم مسلمان دارالاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دارالاسلام قائم کرنے کی ضرور کوشش کریں۔ مگر میرا خیال ہے کہ جو نظام حکومت اس وقت قائم ہے، یا آئندہ "سلطنت در سلطنت" یا آئینی ضمانتوں کے ماتحت ہو وہ بھی شبہ دارالاسلام ضرور ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام حکومت دارالاسلام نہیں ہے اور دارالحرب بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے علماء دارالحرب کے احکام موجودہ نظام حکومت سے متعلق نہیں کرتے اس لیے جبکہ یہ نظام حکومت نہ دارالاسلام ہوا اور نہ دارالحرب تو ان دونوں کے بین بین کوئی چیز ہوا اور اس کو شبہ دارالاسلام ہی سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور جیسا کہ میں نے اوپر کی چند مثالوں سے واضح کیا ہے کہ ہم اس شبہ دارالاسلام میں کل اسلامی حدود جاری نہیں کر سکتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس شبہ دارالاسلام میں مسلم اور غیر مسلم کے مقدمات اور معاملات کے لیے تفقہ فی الدین کر کے کچھ خاص احکام نافذ کر سکیں تاکہ مسلمانوں کو اغیار کی اس اقتصادی غلامی سے نجات ملے جس میں کہ وہ آجکل مبتلا ہیں۔ (۸)۔

بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مگر جیسا کہ میں نے اوپر واضح کرنے کی کوشش کی ہے مسلمانوں کے حقوق کو بحیثیت ایک اقلیت کے اُن کی "سلطنت در سلطنت" اس سے زیادہ محفوظ نہیں کر سکتی جتنا کہ آئینی ضمانتیں، اور اکثریت پارٹی کا آئینی ضمانتوں کو منظور کرنے پر رضامند ہو جانا بہ نسبت "سلطنت درسلطنت" کی تجویز کے زیادہ آسان ہے۔ (۹)

نیز مولانا ممدوح کی "سلطنت در سلطنت" والی تجویز کے سلسلہ میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اگر یہ سلطنت درسلطنت والی تجویز غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے لیے منظور کرلے (۱۰) اور اسی کے ساتھ ہندو اکثریت عیسائی، اور سکھ اقلیتوں کے واسطے بھی اس کو ضروری خیال کرے تو ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ کم از کم چار "سلطنت درسلطنتیں" ہوں گی (۱۱) اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت کے لیے کونسا نظام بہتر اور قابل العمل ہے؟ یعنی۔

(۱) وہ نظام حکومت جس میں ایک سے زیادہ سلطنت درسلطنتیں موجود ہوں۔

(۲) یا وہ نظام جس میں حکومت کو اپنے افراد کے مذہب سے کوئی پیروکار نہو اور اُس حکومت کے افراد کا ہر فرقہ اور ہر گروہ اپنی زبان اور پرسنل لا کے متعلق آزاد ہو۔

پہلے طریقۂ حکومت میں ہر گروہ کی طرف سے جو لوگ برسر اقتدار ہوں گے سو غالباً وہ ہوں گے جنمیں رواداری کم ہوگی اور ایک دوسرے گروہ سے تنازع اور تصادم پیدا کرنیکا جذبہ زیادہ ہوگا۔

دوسرے طریقہ حکومت کو اگر ہر فریق نیک نیتی سے چلانے کی کوشش کریگا تو غالباً وہ زیادہ سہولت سے چل سکے گا، بہر حال ہم مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم ان میں سے کونسا طریقہ اختیار کریں؟ مگر جو بھی کچھ کرنا ہو فوراً کرنا چاہیے۔ اب ایک لمحہ کے انتظار کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ دوسرا طریقہ کار اکثریت پارٹی کی صرف آئینی ضمانتوں اور میثاقوں

پرہی مبنی ہوگا۔ رہا آئینی ضمانتوں اور میثاقوں کا اکثریت پارٹی کی طرف سے ایفا سو یہ مسلمانوں کی رائے عامہ اُن کی یک جہتی اور اتفاق، اور ان کے اپنے واجبی حقوق کی خاطر جان دینے کے لیے تیار رہنے کے جذبہ پر منحصر ہے۔

مسلمان چار صوبوں یعنی پنجاب، سرحد، سندھ، اور بنگال میں اس وقت اکثریت رکھتے ہیں اور چونکہ مسلمانوں کی آبادی غیر مسلم اقوام کی بہ نسبت زیادہ بڑھتی ہے اور اس لیے اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ ان چار صوبوں کے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جاوےگی بلکہ ان کی اکثریت غالباً آئندہ اور زیادہ ہو جاوے گی پس اگر ان چار صوبوں میں مسلمان اپنی اکثریت کی بنا پر اپنے حقوق کی حفاظت کریں گے اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کو ناجائز طور پر پامال کرنے کی کوشش نہ کریں گے تو اغلب یہ ہے کہ اُن صوبوں کی اکثریتیں بھی جن میں مسلمان اقلیت کی حالت میں ہیں مسلمانوں کے حقوق کو بیجا طور پر پامال کرنے کی کوشش نہ کرینگی اگر رواداری کی بنا پر نہیں تو کم از کم مصلحت کی بنا پر ہی۔

ایک سوال البتہ رہ جاتا ہے کہ اگرچہ مسلمان چار صوبوں میں اکثریت کی حالت میں ہیں مگر (Centre) یا مرکزی حکومت میں اب بھی اقلیت کی حالت میں ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے پس اگر مرکزی حکومت ایسے قوانین جاری اور نافذ کرنا چاہے جن سے مسلمانوں کے جائز حقوق پامال ہوتے ہوں تو مسلمانوں کے پاس اس کے دفاع کا کوئی ذریعہ نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ ایسی کارروائی کے خلاف اپنی متفقہ آواز بلند کریں اور اگر مسلمانوں کی سات کروڑ کی آبادی اپنے واجبی حقوق کے لیے، اپنی متفقہ آواز بلند کرے تو کوئی مرکزی حکومت اگرچہ وہ کیسی ہی متعصب ہو مشکل سے مسلمانوں کے ایسے متفقہ احتجاج کو نظر انداز کر سکیگی، لیکن اگر مسلمانوں کے ایسے متفقہ احتجاج کے باوجود کوئی ناعاقبت اندیش مرکزی گورنمنٹ مسلمانوں کے واجبی حقوق کے پامال کرنے پر آمادہ ہی

ہو جاوے تو اس صورت میں مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ وہ بین الملکی جنگ کے لیے تیار رہیں۔

لیکن یہ سب آئینی ضمانتیں اور مواثیق اسی وقت ہمارے کام آسکتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی سات کروڑ آبادی اپنے حقوق کو سمجھے اور ان کی حفاظت کے لیے تن، من اور دھن سے آمادہ ہو جائے

(۱۲) اب یہ کام تعلیمیافتہ طبقہ کا ہے (چاہے ہم پرانی تعلیم کے حامی ہوں یا نئی تعلیم کے مؤید یا دونوں کے) کہ ہم عوام میں جائیں، ان کی حالت کے سدھارنے کی کوشش کریں، غرض ہر طرح سے ان کے کام آدیں، ان میں عمومی تعلیم جاری کریں، ان کو ان کے حقوق سے آگاہ کریں، اپنی بیجا رعونت کو نکال ڈالیں اور اسلام کے زرین اصول کل مومن اخوۃ پر کاربند ہوں۔

پس اگر ہم اپنے کاشتکار، دستکار، پیشہ ور اور مزدور بھائیوں میں جاکر اُن کی خدمت اور اُنکی تنظیم کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو متحدہ عزم اور ارادہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے لوگوں نے ہندو قوم میں پیدا کر دیا ہے وہ ہم مسلمان اپنے سات کروڑ مسلمان بھائیوں میں پیدا نہ کر سکیں (۱۳) مگر یہ جب ہی ہو سکے گا کہ جب ہم میں کے سر برآوردہ افراد خواہ وہ مسٹر جناح ہوں یا نواب چھتاری، مولانا حسین احمد صاحب مدنی ہوں یا مفتی کفایت اللہ صاحب دیہات میں جادیں، کاشتکاروں کی ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں پر بیٹھیں، ان کو یہ محسوس کرادیں کہ یہ بڑے بڑے لوگ ان کے بھائی ہیں، اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ ان کی بھلائی اور بہتری کے واسطے ہی کر رہے ہیں، بس صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے موجودہ سیاسی جنگ میں مسلمان اپنے وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں، اسلام اور شعائر اسلام کو ہندوستان میں تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس موجودہ جنگ میں ہم مسلمانوں کو غیر مسلم اقوام سے خواہ مخواہ معاندانہ اور مخالفانہ طریقہ کار اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے،